

لمعات

(مملکت اسلامی کب بنتی ہے)

ہم شروع سے مسلمانوں کی مملکت اور اسلامی مملکت میں فرق کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اسلامی مملکت کے سلسلہ میں جو سوالات سامنے لائے جاتے ہیں اور اس کی تفصیلات ہم سے پوچھی جاتی ہیں ان کا تعلق مملکت دیا اس کی حکومت، کی ہیئت کفائی سے ہونا ہے۔ یعنی وہ جمہوری ہوگی یا آمرانہ۔ جمہوری ہوگی تو اس کا نظام پارلیمانی ہوگا یا صدارتی۔ منتخب ہوگی تو طریق انتخاب کس قسم کا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی مملکت (یا دنیا کی کسی اور مملکت) اور اسلامی مملکت میں ماہر الاستیاذان کی ہیئت کفائی یا شکل و صورت نہیں۔ ان میں حقیقی فرق بنیادی ہے۔ اسلامی مملکت کی بنیاد ایمان پر جوتی ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینے سے بات کا واضح ہو جانا تو ایک طرف، اس سے مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ ایمان کا صحیح تصور ہی ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ ہماری نئی نسل کو تو چھوڑیے، قدیم نسل کے ہاں بھی ایمان سے مراد چند الفاظ کا دھڑلینا ہوتا ہے اور بس۔ جہاں تک کاروبار حیات اور معاملات حکومت کا تعلق ہے ان پر ایمان کی اہل لڑائی کہیں نظر نہیں آتی۔ نہ ہی کسی کے ذہن میں اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک اس بنیاد کا صحیح تصور ہمارے سامنے نہ ہو، عام ملکوں (حتیٰ کہ مسلمانوں کی ملکوں) اور اسلامی مملکت کا فرق ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس موضوع پر ہم اکثر و بیشتر کہتے چلے آ رہے ہیں لیکن..... ہماری جیشہ تعلیم یا قدیم نسل کی طرف سے جن سوالات کا اعادہ ہوتا رہا ہے، ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان کی روشنی میں اس موضوع کی اہمیت کو سامنے لایا جائے۔ ان نو حجتانِ رسالت کی طرف سے جس قسم کے سوالات پوچھے جاتے ہیں، ان کا لحظہ یہ ہے:-

- (۱) قرآن مجید جن باتوں کو اخلاقی محاسن قرار دیتا ہے۔ مثلاً سچ بولو، بھوٹ نہ بولو، کسی کو فریب نہ دو، چوری نہ کرو، عصمت کی حفاظت کرو، کسی پر ظلم اور تیراوتی نہ کرو۔ کسی کو ناحق مستأذ نہیں، غریبوں کی مدد کرو۔ محتاجوں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرو۔ وظیم و غیریہ۔ ایک شخص ان امور کا پابند ہے لیکن وہ نہ خدا کو مانتا ہے نہ وحی کو، نہ رسالت پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ تو اس کے اس انکار سے اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور جو شخص ان امور پر ایمان رکھتا ہے اس میں اور اقول الذکر میں عملی نقطہ نگاہ سے کیا فرق ہوتا ہے
- (۲) ایک قوم اپنے ہاں (مثلاً) وحی اقتصادی نظام رائج کر لیتی ہے جسے مشرک آن تجویز کرتا ہے لیکن وہ وحی خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتی۔ تو اس کے اس اقتصادی نظام کو اسلامی کیوں کہا جاسکتا۔ یا
- (۳) مسلمانوں کی کوئی مملکت ایسے معاشی نظام کو اپنے ہاں رائج کر لیتی ہے جسے قرآن نے تجویز کیا ہے

تو یہ باقی شعبوں میں اس کا التزام نہیں کرتی، تو کیا اس مملکت کو اسلامی مملکت کہا جاسکے گا۔ اگر اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا، تو ایک مملکت یا ایک نظام (سistem) کس وقت اسلامی کہلانے کا مستحق سمجھا جائے گا۔ یہ ہے شخص ان سوالات کا جو ہمیں اس سلسلہ میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ آئیے، ہم ان پر سطح سے ذرا نیچے آنکھ کر غور کریں۔

ۛ

ان سوالات اور اسی قسم کے دیگر شکوک و شبہات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ اور یہ شکوک اس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہمارا وجود ان طبقہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، فلانہ خدا، رسول، وحی، آخرت پر ایمان کے دعویدار ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ بالعموم ان لوگوں سے بھی پست ہیں جنہیں یہ دہریے اور ملحد کہتے ہیں۔ بنابرین سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان کچھ کسے ہیں۔ ایمان چند الفاظ کے دہرائے کا نام نہیں۔ ایمان انسانی زندگی کے متعلق ایک خاص نقطہ (ATTITUDE) کا نام ہے۔ مثلاً انسان زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی پچھلے عام حیوانی پھول کی طرح، نر و مادہ کے جنسی اختلاط سے وجود میں آجاتا ہے۔ وہ طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتا — کھاتا، پیتا، سوتا، جاگتا اور افزائش نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد طبعی قوانین کے مطابق مر جاتا ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان ایک متمکن حیوان واقع ہوا ہے، اس کے لئے اس کا سوسائٹی میں رہنا ضروری ہے۔ اور سوسائٹی میں رہنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متعین کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو مصلحت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

ایک نظریہ زندگی یہ ہے اور دوسرا نظریہ یہ کہ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے انسان اور حیوان میں بے شک کوئی فرق نہیں، لیکن انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں۔ اس کی طبعی زندگی حیات کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس کی آخری کڑی نہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بھی جاری رہنا ہے طبعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے تو طبعی قوانین کافی ہیں، لیکن ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے طبعی قوانین سے ماوراء ایک اور ضابطہ قوانین کی ضرورت ہے جنہیں مستقل اقتدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقتدار نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہیں نہ سوسائٹی کی۔ یہ ازل اور ابدی ہیں اور انسان کو ان کا علم اس وحی کی مدد سے حاصل ہوتا ہے جو انبیاء کو ہم پر نازل ہوئی تھی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمال حیات، مستقل اقتدار کے مطابق ہیں تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اسے اخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی پست سطح میں محسوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اعمال کے ان اثرات کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہوتی ہے نہ عدالت کی، یہ خدا کے قانون مکافات کی مدد سے از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں اور ماٹھ ہوتے ہیں۔

یہ ہے زندگی کا دوسرا نظریہ۔ اس نظریہ کو ہم ولہیریت اور عقل و فکر کی مدد سے بنی برصدقت اور حقیقت سمجھنا اور قدم قدم پر اسے پیش نظر رکھنا۔ ایمان کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس طبعی زندگی کے نظریہ حیات کو قرآن کھڑے تعبیر کرتا ہے، وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَسْأَفُوفٌ وَّيَا حٰكِمُونَ كَمَا تَأْتِي الْاَفْئَامُ۔ (یہ لوگ

تو یہ باقی شعبوں میں اس کا التزام نہیں کرتی، تو کیا اس مملکت کو اسلامی مملکت کہا جاسکے گا۔ اگر اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا، تو ایک مملکت یا ایک نظام (سسٹم) کس وقت اسلامی کہلائے گا مستحق سمجھا جائے گا۔ یہ سے مخصوص ان سوالات کا جو ہمیں اس سلسلہ میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ آئیے، ہم ان پر اس طرح سے ذرا نیچے اتر کر غور کریں۔

۵۰

ان سوالات اور اسی قسم کے دیگر ٹھوک و شبہات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ اور یہ ٹھوک اس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہمارا ان جو ان طبقہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، فلہذا خدا، رسول، وحی، آخرت پر ایمان کے دعویدار ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ بالعموم ان لوگوں سے بھی پست ہیں جنہیں یہ دہریے اور ملحد کہتے ہیں۔ بنا بریں، سب سے پہلے کھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان کچھ کسے ہیں۔ ایمان چند الفاظ کے دہرا لینے کا نام نہیں۔ ایمان انسانی زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ، یا (ATTITUDE) کا نام ہے۔ مثلاً انسان زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی ہجو عام حیوانی پھول کی طرح، نر و مادہ کے جنسی اختلاط سے وجود میں آجاتا ہے۔ وہ طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتا — کھاتا، پیتا، سوتا، جاگتا اور افزائش نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد طبعی قوانین کے مطابق مر جاتا ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان ایک متمدن حیوان واقع ہوا ہے، اس کے لئے اس کا سوسائٹی میں رہنا ضروری ہے۔ اور سوسائٹی میں رہنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متعین کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو مصلحت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

ایک نظریہ زندگی یہ ہے، اور دوسرا نظریہ یہ کہ جہاں تک طبعی زندگی کا تعلق ہے انسان اور حیوان میں بے شک کوئی فرق نہیں، لیکن انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں۔ اس کی طبعی زندگی حیات کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس کی آخری کڑی نہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بھی جاری رہنا ہے طبعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے تو طبعی قوانین کافی ہیں، لیکن ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے طبعی قوانین سے ماوراء ایک اور ضابطہ قوانین کی ضرورت ہے، جنہیں مستقل اقتدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقتدار نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہیں نہ سوسائٹی کی۔ یہ ازل اور ابدی ہیں اور انسان کو ان کا علم اس وحی کی مدد سے حاصل ہوتا ہے جو انبیاء کو لے کر پرنازل ہوئی تھی۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتسم ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمال حیات، مستقل اقتدار کے مطابق ہیں تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل لے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اسے اخروی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی پست سطح میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اعمال کے ان اثرات کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہے نہ عدالت کی، یہ خدا کے قانون مکافات کی مدد سے از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں اور مشہور ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کا دوسرا نظریہ اس نظریہ کو علم و بصیرت اور عقل و فکر کی مدد سے جنی برصدقت اور حقیقت سمجھنا اور قدم قدم پر اسے پیش نظر رکھنا۔ ایمان کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس طبعی زندگی کے نظریہ حیات کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے، وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمِلُوا كَالْإِنْعَامِ غُلًا مَّنْعَوْنَ وَيَا كَلْبُونَ كَيْفَ تَأْكُلُ الْأَعْمَالُ مَنَعُوا (پہلا) جو لوگ

کرے۔ اگر جدوجہد ہی نہ ہو تو ایمان نتائج کیا پیدا کرے گا؟ آپ ذراعت سے متعلق قوانین سے تہرہ واقفیت رکھیں اور ان قوانین کی صداقت پر آپ کو لاکھ یقین ہو، آپ کی زمین سے فصل اسی وقت پیدا ہوگی جب آپ ان قوانین کے مطابق کھیتی کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر کی ہے۔ مثلاً سورہ عنکبوت میں ہے: **أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يَتْرُكُوا أَنْ يَقُولُوا إِنْ هَذَا إِلَّا هُفَاً لَا يَفْتَنُونَ** (۱) کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں چھوٹے دھبے جائیں گے اور وہ ان پھٹیوں میں سے نہیں گزارے جائیں گے (جن سے گزر کر سونا کنڈن بنتا ہے) سورہ توبہ میں ہے کہ جب منافقین آکر کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جاتا تھا کہ قُلِ اعْمَلُوا - فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَتُرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ (۲)۔ تمہارا دعویٰ ایمان ہم نے سن لیا ہے اب تم کچھ کر کے دکھاؤ۔ خدا اور اس کا رسول اور جماعت مومنین تمہارے کام دیکھ کر (اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ تم واقعی ایمان لے آئے ہو یا یہ یونہی رسماً الفاظ کا دہرا دینا ہے)۔ سورہ النعام میں ہے کہ جب قانون مکافات کی رو سے لوگوں کی فطرت و کشش کی پیدا کردہ تباہیاں سامنے آجائیں گی تو اس وقت نہ تو اس شخص کا ایمان اسے کچھ فائدہ دے گا جو ان تباہیوں کو دیکھ کر ایمان لائے گا۔ **أَوْ كَسِبَتْ فِي أِيْمَانِهَا خَيْرًا** (۳) اور نہ ہی اس شخص کا ایمان جس کے ایمان کے ساتھ اچھے اعمال شامل نہ ہوں گے۔ اسی سورہ میں دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ خدا لوگوں کے غالی دعوائے ایمان کی بناء پر ان کا دوست اور کارساز نہیں بنتا۔ **هُوَ وَلِيُّ الْمُشْرِكِينَ** (۴) وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا دوست ہوتا ہے۔ یہ "ایمان بلا عمل" والے ہی ہیں جن کے متعلق کہا کہ **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ** (۵) لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ مومن ہوتے نہیں۔ ایمان افسانہ اعمال کے لئے جذبہ محرکہ ہوتا ہے جو جذبہ اعمال کا محرکہ نہیں بنتا، وہ ایمان ہی نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں — مردہ آل ایمان کہ ناپید در عمل

(۰)

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ایمان اور عمل کا باہمی تعلق کیا ہے۔ بادی فی الواقع یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ طبعی نظریہ حیات کی رو سے اخلاق (MORALS) کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کا تصور تو اقتدار (VALUES) سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب طبعی نظریہ زندگی کی رو سے مستقل اقتدار کا کوئی وجود ہی نہیں، تو اس میں اخلاق کا تصور کہاں سے آجائے گا؟ آپ سوچئے کہ جو شخص نہ مستقل اقتدار کا قائل ہے اور نہ ہی تسلسل حیات یا قانون مکافات کو تسلیم کرتا ہے، وہ اگر کوئی "نیک کام" کرتا ہے تو اس کے لئے اس کا جذبہ محرکہ کیا ہو سکتا ہے؟ دین ان کے کے الفاظ میں :-

خدا پر ایمان مرکز ہے اور بقائے حیات پر ایمان محیط۔ تمام مسئلہ اخلاقیات کی بس یہی کلید ہے۔ وہ مستقل اقتدار جن کے توسط سے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں، ابد کا

(GOD AND THE ASTRONOMERS)

اور غیر فانی ہیں۔

(THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ:

راشد، اپنی مشہور کتاب

یہ ناممکن ہے کہ حقیقت کے متعلق ہمارا نقطہ نگاہ علم الاخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو اور اخلاقیات کے متعلق ہمارا نظریہ، تصور حقیقت کو متاثر نہ کرے۔ لہذا اخلاقی قوانین کے مستقل اور مطلق ہونے کے لئے خدا پر ایمان لانا ٹھیک ہے۔

(DESTOJEVSKY) نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

اور

اگر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔

بات بالکل واضح ہے۔ "خدا پر ایمان" نہ ہو تو نظریہ زندگی طبعی رہ جاتا ہے اور اس نظریہ کی رُو سے زندگی، حیوانی سطح پر آجاتی ہے۔ حیوانی زندگی، بنیادی جبلتوں (BASIC INSTINCTS) کے

سہارے قائم رہتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا جذبہ، تحفظ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہے۔

اس جذبہ کا تقاضا ہے کہ ایک فرد، زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹے، اور چونکہ (حیوانی سطح زندگی پر) مستقل اقدار کا تصور نہیں ہوتا، اس لئے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کے سلسلہ میں "جائز اور ناجائز" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قوانین کا فرما ہوتے ہیں۔

سوا دل تو سوسائٹی کے قوانین سے گریز (EVASION) کی سینکڑوں شکلیں انسان تراش لیتا، اور تراش

سکتا ہے۔ دوسرے، سوسائٹی کے قوانین، خود ان افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں جو "زیادہ سے زیادہ سمیٹنے" میں

سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اس نظریہ کے حاملین سے یہ توقع کرنا کہ وہ جان مار کر محنت کریں اور اپنی محنت کی کمائی میں سے زیادہ سے

زیادہ دوسروں کے لئے دے دیں، اس نظریہ کی اصل و اساس کے خلاف ہے۔ جو شخص یا قوم حیوانی جذبہ

تحفظ خویش کے تابع، دوسروں کا سب کچھ سمیٹنے کی فکر میں ہو، وہ اپنا سب کچھ دوسروں کو کیسے دے دے گی۔

اس نظریہ زندگی کے حامل، اگر دوسروں کے لئے کچھ دیں گے بھی، تو اس کا جذبہ محرکہ کچھ اور ہوگا۔ مروجہ قانون

کا ڈر، ستائش کی تمنا، صلہ کی امید، سوسائٹی میں پاپور ہونے کا جذبہ۔ قرآن کریم اس جذبہ محرکہ کو

"رِئَاءَ النَّاسِ" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ النعام میں ہے۔ وَالَّذِينَ يُبْفِقُونَ آمُوالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ (پہلے) جو لوگ اپنے مال و دولت کو

طمان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ پروفیز صاحب کی تالیف "انسان نے کیا سوچا" باب اخلاقیات۔

صاحب اچھے دلائل ہیں "ہنوز ہمارے سامنے مستقل اقدار کا تصور تھا، تو "ریاکاری" کی اصطلاح

فریب کاری کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔" وہ بڑا دیکھا کار ہے۔ اس کے معنی ہی یہ ہوتے تھے کہ

وہ بڑا چالبار اور فریب کار ہے، اب ریاکاری، معاشرہ کا عام معمول ہو چکی ہے۔ اسے اب (POPULARITY) سمجھا جاتا ہے۔

لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے کس وضاحت سے یہ بات کہی ہے کہ اگر خدا اور آخرت پر ایمان نہ ہو تو پھر اتفاق کا جذبہ ہوگا۔ دواء الناس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے کہ ذیق الاغراب من یثخن مما یثخن مخرما (۹) یا ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قانون کے خوف یا حکام کی خوشنودی کے لئے عطیات دیتے ہیں تو چونکہ اس کا جذبہ محرکہ ان کے دل کا تقاضا نہیں ہوتا اس لئے ایسا محسوس کرتے ہیں گو یا پتلی پھیر رہے ہوں۔ اس کے مقابل میں جو لوگ "انفاق فی سبیل اللہ" کرتے ہیں۔ یعنی مستقل اقدار اور تسلسل حیات پر ایمان رکھتے ہوئے، دوسروں کی نشوونما کے لئے اپنی کمائی کو کھلا رکھنے والے۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جہنمیں کچھ دیتے ہیں، ان پر کسی قسم کا احسان نہیں دھرتے، انہیں بطور خیرات نہیں دیتے جس سے ان کے جذبہ عزت نفس کو ٹھیس ملے۔ (۱۰) وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان ضرورت مندوں کا حق ہے جسے وہ ادا کر رہے ہیں۔ ذیق اموا الیہم حق متعلوہم۔ (۱۱) یا امحرؤم۔ (۱۲)۔ لہذا، وہ ان سے کہتے ہیں کہ۔ لا تریئو منکم حذرآء فرلا مشکوٰۃ۔ (۱۳) ہم تم سے اس کا نہ کوئی صلہ مانگتے ہیں نہ ہی ہم سنکر یہ تک کے منتہی ہیں۔ اسی لئے جماعت مومنین سے کہا گیا کہ۔

جو کچھ تم ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیتے ہو، اس کا احسان جتنا کر اور یوں ان کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچا کر اپنے کئے کرائے کو ضائع نہ کرو، اس شخص کی مانند جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور لوگوں کو دکھانے کی خاطر، اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ پتھر کی کسی چٹان پر ڈرا سی مٹی پڑی ہو۔ اس پر زور کی بارش پڑے، اور وہ اس مٹی کو بہا کر لے جائے اور وہ چٹان صاف کی صاف رہ جائے۔ اس کے برعکس، وہ لوگ جو مستقل اقدار خداوندی کی رو سے اس ایمان کی بنا پر دوسروں کو دیتے ہیں کہ اس سے ان کی اپنی ذات میں ثبات اور استحکام پیدا ہو جائیگا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اونچی سی زمین پر نہایت عمدہ باغ ہو۔ جب وہی بارش برسے گی تو اس سے باغ میں گولیاں پھیل آئے گا۔ اور اگر وہاں زور کی بارش نہ بھی ہو بلکہ پونہی چھو بارسی پڑے تو بھی اس کی سیرابی کے لئے کافی ہو جائے۔

(۲۶۵-۲۶۷) ذ (۲۱۶)

اس کے بعد قرآن بتاتا ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد، خدا اور آخرت کے ایمان پر ہوگی، اس کے نتائج، تمہاری آئندہ نسلوں تک کو بھی منتقل کرتے رہیں گے۔ یہی وہ اساس حکم ہے جس سے اس زعمارت کو پائیداری نصیب ہوگی۔ غلط نظام میں نیکیوں کے کام کچھ وزن نہیں رکھتے، اس لئے کہ ان کا جذبہ محرکہ محکم نہیں ہوتا۔ سورۃ توبہ میں قریش کو مخاطب کر کے کہا کہ۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینا اور کعبہ کی تزئین و آرائش

کہ دینا، اس شخص (کے کاموں) کی مانند ہو جائے گا جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور خدا کی راہ میں مصروف ہو رہا ہے۔ (تم اپنے ذہن سے جو چاہے فیصلہ کرو) میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (۱۹)

سورۃ بقرہ میں ہے۔

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف، نیکی یہ ہے کہ تم خدا آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لائے کہے بعد، اپنے مال کو، اس کی کشش و جاذبیت کے باوجود، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو.....

(۲۰)

کفر کا نظریہ زندگی رکھنے والوں کے متعلق کہا کہ ”اُن کے اعمال کی مثال یوں سمجھو جیسے راکھ کا ڈھیر ہو اور جب کھڑے چلے بہت زور کا۔ وہ اُسے اڑا کر لے جائے گا۔ (۲۱) کفر کے نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کی تمام سعی و محنت اس دنیا کے مفادات ہی ہو سکتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے۔

کیا ہیں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ خسارہ میں رہنے والے لوگ کون ہیں! وہ جن کی ساری کوششیں اسی دنیا کے مفاد کے حصول میں کھو گئیں اور اپنے دل میں سمجھتے رہے کہ ہم بڑے کارِ بڑے مال و سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی اور حیاتِ آخرت سے انکار کرتے ہیں۔ سوان کا کیا کر! یا سب را ٹیگاں چلا گیا۔ نتائجِ برآمد ہونے کے وقت ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزانِ تک بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔ (۲۲)

سورۃ محمد میں ہے کہ تم روٹے زمین پر چلو پھرو۔ اور پھر دیکھو کہ جن قوموں کا نظریہ حیات، طبعی زندگی تھا، ان کا انجام کیا ہوا؟ (۲۳) ان کے اعمال را ٹیگاں گئے اور آخر الامر وہ بڑے خسارے میں رہے۔ (۲۴) ایمان بالآخرت کی اہمیت کے متعلق راستہ دل لکھتا ہے۔

انسان کے موجودہ اعمال اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال آج ہوں گے اسی قسم کا اس کا ”کل“ ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا۔ اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا، کیونکہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ جو یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سرکھپانے کی ضرورت کیا ہے؟

حُقرآن مجید میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ مثلاً (۲۵)، (۲۶)، (۲۷)، (۲۸)، (۲۹)۔

یہ ہے ایمان کا تعلق اعمال کے ساتھ۔ اسے پھر سمجھ لیتے ہیں کہ ایمان (نظریہ حیات) میں عمل کے لئے جذبہ محرک کتنا ہے اس لئے اعمال کو ایمان سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ جو جذبہ بھی آپ کے عمل کا محرک ہوگا، وہ آپ کا "ایمان" کہلائے گا۔ ہم اس وقت بات کی وضاحت کے لئے اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ ورنہ قرآن نے صحیح نظریہ زندگی کو ایمان اور غلط نظریہ کو کفر — یعنی صحیح نظریہ سے انکار — کہہ کر بکارا ہے۔ اگر آپ "ایمان" کی جگہ نظریہ زندگی کہہ لیں تو پھیر لیں کہا جائے گا کہ نظریہ زندگی ان مقاصد کا تعین کرتا ہے جن کے حصول کے لئے انسان کوشش کرتا ہے۔ یوں ایمان، عمل کی بنیاد قرار پا جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق پیکال نے کہا ہے کہ

انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے۔۔۔ جب اسے ایمان کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتی تو وہ ہیکار اور غراب مقاصد پر تکیہ جاتا ہے۔ خلا، قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض مادی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور مدد خانی دنیا میں بھی خدا ناممکن ہے۔ انسان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اچھے نصب العینوں کو شکست ہو جائے تو بُرے راستے اسے اچھے لگنے لگ جاتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے۔ بے ماہ روی ختم ہو اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں ایمان کی حرارت ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔

ایمان "در حقیقت انسان کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ" میں ایسا کیوں کروں؟ اور جو شخص مستقل انداز حیات (خدا، وحی، رسالت) اور انسانی ذات (مکانات، عمل اور حیاتِ آخرت) پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس سوال کا اطمینان بخش جواب دے نہیں سکتا کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنی جان کیوں مارے؟ اگر اس کا جواب کسی دنیاوی فائدے کا حصول نہیں تو جذبہ باقی ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جذبات کسی نظام عمل کے لئے حکم اور پائیدار اساس بن نہیں سکتے۔ اساس حکم تو صحیح نظریہ حیات کی صداقت پر یقین حکم ہی بن سکتا ہے۔ طبعی نظریہ حیات نے اسی اساس حکم کو گم کر دیا ہے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام دونوں کی زندگی جہنم کی سی ہو رہی ہے۔ عصر حاضر کے ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر یگس نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں لکھا ہے کہ

میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیہ نفس کیا، ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس میں زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویہ نگاہ کی کمی نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو مٹا کر دیا تھا جو زندہ مذہب انسانوں کو ہمیا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دے دی جائے جو ان سے گم ہو چکی تھی یہی ان کی دوا تھی — عقیدہ، امید، محبت، نگاہ خود میں۔ (۲۰۲۴)

ما صحیح نظریہ زندگی قرآن مجید ہی سے مل سکتا ہے اسے ہم علی وجہ البصیرت ثابت کر سکتے ہیں لیکن اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں

اور یہی ”شے“ ہمارے ہاں بھی مفقود ہے۔ ہماری دشواری ایک اور بھی ہے۔ ہم جب اپنے آپ کو مسلمان اور دوسروں کو غیر مسلم (کافر) کہتے ہیں تو اس سے سمجھ یہ لیتے ہیں کہ ہم صاحب ایمان ہیں اور غیر مسلم کہا بیان نصیب نہیں۔ اس بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہوتے کے بعد جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اخلاقی جمہوریت سے کس قدر پست ہیں اور بعض غیر مسلم بڑے اچھے اچھے کام کرتے ہیں، تو ہمارے دل میں لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کا اعمال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر ایمان اور اعمال کا تعلق لایفک ہوتا، تو ہم مسلمان یعنی صاحب ایمان) اچھے کام کرتے اور غیر مسلم اخلاقی اعتبار سے پست سطح پر ہوتے۔ اس خیال کی وجہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ غلط فہمی ہے جس کی زد سے ہم نے اپنے آپ کو صاحب ایمان سمجھ رکھا ہے۔ (جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے، ایمان ایک نظر پر حیات کو معنی ووجہ البصیرت قبول اور اختیار کرنے کا نام ہے۔ یہ قلبِ دماغ کا ایک مثبت عمل ہے جس سے انسان میں ایک خاص قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہی نظریہ انسانی زندگی کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کو ”نیک کام“ کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ زندگی (ایمان) اور اس کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی نیک اعمال (اعمالِ صالح) کی عمارت کا نام ”الاسلام“ ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ

- (۱) اسلامی مملکت اسے کہیں گے جس کا تمام کاروبار (کوئی ایک گوشہ نہیں بلکہ تمام کاروبار) وحی (قرآن) کی عطا کردہ متعلق اقدار کے تابع سرانجام پائے۔ اس قسم کی مملکت کے نظام کو اسلامی نظام کہا جائے گا۔
- (۲) یہ ہو نہیں سکتا کہ مملکت کا کوئی ایک گوشہ (سیاسی، معاشرتی، معاشی) تو اسلامی ہو، اور باقی شعبے غیر اسلامی ہوں یا باقی تمام شعبے اسلامی ہوں اور کوئی ایک شعبہ غیر اسلامی ہو۔ اگر مملکت کا کوئی ایک گوشہ بھی غیر اسلامی ہوگا تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکے گی۔ اسلامی مملکت کا ہر گوشہ اسلامی ہوتا ہے۔ جنت کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جیسے جہنم کہا جاسکے۔ نہ ہی جہنم کا کوئی ایک گوشہ جنت قرار پاسکتا ہے۔ جس طرح انسان کا کوئی حصہ مومن اور کوئی حصہ کافر نہیں ہوتا اسی طرح مملکت کا ایک گوشہ اسلامی اور دوسرا گوشہ غیر اسلامی نہیں ہو سکتا۔
- (۳) اس قسم کی (اسلامی) مملکت ان لوگوں کے ہاتھوں قیام پذیر ہوتی ہے جو خدا وحی رسالت (مستقل اقدار حیات، انسانی ذات، قانون، مکانات، عمل اور تسلسل حیات) مرنے کے بعد کی زندگی پر عملی وجہ البصیرت لیتے ہیں۔ اور ان کے اس یقین (ایمان) کا مظاہرہ ان کے اعمال حیات، ان کی بصیرت و کردار ان کے روزمرہ کے کاموں سے ہو۔ انہی افراد کی ہیئت اجتماعی کو ملت اسلامیہ، امت مسلمہ، جماعت مومنین، کہا جاتا ہے۔ مملکت قرار و اور مقاصد پاس کر کے۔ چند شرعی قوانین نافذ کرتے۔ یا کسی خاص ٹائپ کی حکومت قائم کرنے یا کوئی خاص معاشی پروگرام اختیار کرنے سے اسلامی نہیں بن جاتی۔ نیست! (ابن کار فقیہاں اسے پسر! مملکت افراد مملکت کے قلب و نگاہ میں تبدیلی سے اسلامی بن سکتی ہے اور قلب و نگاہ کی تبدیلی صحیح تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔